عرب ریاستیں اور جمہوریت
تبدیلی ــــ حقیقت یا سراب!

عمانویل سیوان*

ترجمہ: عبدالحمید اعظمی

متعدد مبصرین کی رائے میں ۱۹۹۹ء عرب ممالک میں جمہوریت کے فروغ کا سال تھا۔ یمن، مصر اور تیونس میں صدارتی انتخابات نسبتاً زیادہ آزاد ماحول میں وقوع پذیر ہوئے۔ ستمبر میں الجزائر نے سات سالہ خانہ جنگی کے خاتمے کے لیے ان مسلم ''باغیوں'' کو عام معافی دینے کے لیے استصواب رائے کا اہتمام کیا، جو غیر مسلح ہونے پر تیار ہوں۔ اردن اور مراکش میں پختہ کار اور تجربہ کار حکمرانوں کے بعد نوجوان اولاد ان کی وارث بنی۔ ان واقعات سے یہ اندازہ ہوا کہ ایسی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جو عرب سیاست میں عوام کی شمولیت اور اشتراک عمل کی نشان دہی کرتی ہیں۔ لیکن کیا یہ سیاسی تبدیلی بامقصد بھی ہے؟ اس ضمن میں بہت سے شکوک وشبہات جنم لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مبارک چوتھی بار منتخب ہوئے۔ تیونس کے زین العابدین بن علی تیسری بار اور یمن کے عبداللہ صالح دوسری بار کامیاب ہوئے۔ یہ تینوں حکمران بالترتیب ۱۸، ۱۲ اور ۵ سال سے کاروبار سلطنت سنبھالے ہوئے ہیں۔ مبارک کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ صالح کی مخالفت محض برائے نام تھی کیونکہ ان ہی کی جماعت کا ایک رکن میدان میں اتارا گیا تھا (حزب مخالف کے کسی رکن کو انتخابی کمیشن نے انتخابات میں حصہ لینے کا اہل قرار نہیں دیا)۔ تیونس میں دو افراد نے انتخاب میں حصہ لیا تھا جن کا تعلق ملک کی نہایت ہی چھوٹی مخالف جماعتوں سے تھا جنہیں بمشکل تمام ۰٫۶ فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ اس صورت حال کے پیش نظر صدارتی دفتر کو انتخابی حلقوں میں ردوبدل کرنا پڑا کیونکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ حزب اختلاف کو ۲۰ فیصد نشستیں حاصل ہوں گی۔ الجزائر

* Emmanuel Sivan, "Illusions of Change", *Journal of Democracy*, Vol. 11, No. 3, July 2000, pp. 69-83.

میں فوجی حمایت یافتہ امیدوار عبدالعزیز بوطفلیقا کے مقابلے میں حزب اختلاف کے امیدواروں نے مقابلے میں شرکت سے معذوری ظاہر کی کیونکہ حکومت ان کے فعال کارکنوں کو سخت گیری کا نشانہ بنا رہی تھی۔ ستمبر کے استصواب رائے کے دوران غیر مسلح ہونے والے باغیوں کو عام معافی دینے کے خلاف کوئی اشتہار سرکاری ریڈیو اور ٹیلی وژن پر نشر کرنے کی اجازت نہیں تھی اور اس تجویز پر کسی قسم کا بحث ومباحثہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ ان انتخابات میں رائے دہندگان کی تعداد بھی مبصرین کے لیے تعجب خیز تھی۔ مصر میں ایک تہائی اور تیونس میں ۴۰ فیصد نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ انتخابات میں دھاندلی مشرق وسطیٰ میں عام ہے لیکن اب کی بار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ رہ گیا یہ سرکاری اعلان کہ تبدیلی کی ایک نئی لہر آ گئی ہے تو اس دعوے کی قلعی اردن کے Jordon Institute of Strategic Studies کی جون ۱۹۹۹ء کی ایک تحقیق نے کھول دی ہے۔ اس تحقیق کے مطابق ۷۱ فیصد افراد نے یہ کہا کہ وہ عوامی امور پر کھل کر بات کرنے سے اب بھی خائف ہیں۔ صرف ۱۶ فیصد کا جواب تھا کہ انہیں حکومت پر تنقید کرنے کا کوئی خوف نہیں ہے۔

عرب رائے دہندگان کی انتخابات سے لاتعلقی کی ایک وجہ سرکاری ذرائع ابلاغ پر ان کی بے اعتمادی بھی ہے۔ مصنوعی سیارے سے عربی زبان کے پروگرام بڑے شوق سے سنے جاتے ہیں جو نسبتاً زیادہ آزادی سے اظہار رائے کرتے ہیں۔ اس میں جزیرہ چینل بھی شامل ہے جو قطر کے باہر سے کسی علاقے سے نشر ہوتا ہے۔ دیگر مقبول پروگرام وہ ہیں جو ریڈیو مانٹی کارلو اور فرانسیسی زبان میں مواصلاتی سیاروں یا کیبل کے ذریعے ٹیلی وژن پر شمالی افریقہ میں دیکھے اور سنے جاتے ہیں۔ اردن کے عبداللہ ثانی اور مراکش کے محمد سادس نے اپنے پیش رووں کے صحافت پر نافذ کردہ سخت قوانین میں اس لیے قدرے نرمی برتی ہے تاکہ کٹر مسلم تحریکوں کے خلاف کارروائیوں کی داد مل سکے۔ لیکن یہ مصالحت پسند رویہ ایک خاص حد تک ہی قائم رہا۔ اردن میں حزب اختلاف کے دو اخباروں کے مدیر اس بنا پر گرفتار کر لیے گئے کہ انہوں نے وزیراعظم کے بیٹے کی ایک خبر شائع کی تھی جو عقبہ میں زیر تربیت لڑکیوں کے ساتھ کھلے عام فحش حرکات کا مرتکب ہوا تھا۔ وزیراعظم کا قائم کردہ حقوق انسانی کا دفتر بھی اس معاملے میں بے دست و پا ثابت ہوا۔ مصر میں اسلام پسند اخبار ''الشعب'' کے دو مدیروں کو سخت سزائیں سنائی گئیں کیونکہ انہوں نے

نائب وزیراعظم پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے یہودیوں سے تجارت میں ذاتی فائدہ اٹھایا ہے۔ یمن اور الجزائر میں بھی اسی قسم کے الزامات کے تحت صحافیوں کو مستوجب سزا گردانا گیا۔

حقوق انسانی کے ایک فلسطینی رضا کار عیاض السراج کے بقول یہ سب کچھ حکمرانوں پر عوام کے عدم اعتماد کا مظہر ہے۔ اس صورت حال پر ایک مراکشی مبصر نے دلچسپ مثال دی کہ ''جب کبھی میں عرب تبصرہ نگاروں کی یہ رائے پڑھتا ہوں کہ پولیس کا فرض عوام کی دست گیری ہے نا کہ انہیں زدوکوب کرنا تو مجھے ایک کہانی یاد آ جاتی ہے کہ ایک مریض ماہر نفسیات کے پاس گیا اور کہا کہ وہ گندم کا ایک دانہ ہے اس لیے جیسے ہی وہ کسی مرغی کو دیکھتا ہے خوف کے مارے اس کا برا حال ہو جاتا ہے۔ ماہر نفسیات کے چند روز علاج کے بعد اس کی یہ تکلیف رفع ہو گئی اور وہ خود کو انسان سمجھنے لگا۔ معالج کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس نے کہا'' جناب مجھے یقین ہے کہ میں انسان ہوں لیکن کیا یہ بات مرغی کو بھی معلوم ہے؟'' اس لیے پولیس کی انسان دوستی کے تبصرے پڑھ کر مجھے پولیس مقابلے میں قتل کے درجنوں واقعات، ہزاروں باعزت شہریوں کی تذلیل اور اذیت اور لاکھوں افراد کی سیاسی گرفتاریاں ذہن میں چکر لگانے لگتی ہیں اور میں دل سے سوال کرتا ہوں کیا پولیس (یعنی کہانی کی مرغی) کو یہ علم ہے کہ ہم انسان ہیں۔''

یہ الفاظ حسن ثانی کی وفات سے پانچ ماہ قبل تحریر کیے گئے تھے۔ امید ہے اب مصنف کو محمد سادس کے دور میں زیادہ اطمینان ملا ہوگا کیونکہ مراکش کے وزیر داخلہ دریس بصری عہدے سے برطرف کیے جا چکے ہیں، جنہوں نے بیس سال تک دہشت پھیلا رکھی تھی۔ اب مخالفین سے سلوک میں قدرے نرمی آ چکی ہے اور مزید رعائتوں کے وعدے کیے جا رہے ہیں۔ دیکھیے یہ وعدے کب ایفا ہوتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی طے نہیں ہے کہ بادشاہ کی نیت ملک کو ایک دستوری سربراہ کی حیثیت سے چلانے کی ہے یا ایک روشن خیال مطلق العنان کے طور پر۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی وزارت داخلہ، خارجہ، دفاع، انصاف اور مذہبی امور جیسی اہم وزارتوں کے سیاہ وسفید کے خود ہی مالک ہیں۔ بصری کی جگہ احمد مضاوی کو خود بادشاہ نے مقرر کیا ہے۔ اسی طرح وزارت اطلاعات کے عہدوں پر بھی جن کی تقرری ہوئی ہے وہ شاہ ہی کے آدمی ہیں۔ فوج کے سربراہ کو (جو مملکت کا تیسرا سب سے اہم عہدہ ہے) تبدیل نہیں کیا گیا۔ وزیراعظم عبدالرحمن یوسفی حزب اختلاف کے ایک قائد ہیں جو ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں کامیاب ہوئے اور حسن

ثانی نے جن کا تقرر کیا تھا۔ (مراکش میں یہ نوبت پہلی بار آئی تھی) لیکن یوسفی کا دائرہ کار محض معاشی اور معاشرتی امور تک ہی محدود ہے۔

مصر میں بھی صدر حسنی مبارک کے دوبارہ انتخاب کے بعد عاطف عبید نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا تو انہوں نے اہم اور بااختیار وزارتوں میں کوئی ردوبدل نہ کیا البتہ ۱۱ وزارتیں جو زیادہ تر معاشی امور سے متعلق تھیں، تبدیل کی گئیں۔ ایوان حکومت کے دو اہم ستون عسکری جاسوسی (ملٹری انٹیلی جنس) کے سربراہ عمر سلیمان اور وزیر دفاع مارشل طنطاوی اپنی جگہ قائم رہے۔ عبید کاروبار سلطنت میں نئے نہیں ہیں۔ وہ مبارک کے عہد صدارت میں ہر حکومت میں سوائے ایک کے بہ حیثیت وزیر شامل رہے۔ ان کی کابینہ کے دو تہائی وزراء گئے وقتوں کے لوگ ہیں، ان میں سے دو ایسے ہیں جو صدر سادات کی کابینہ میں بھی شامل تھے۔

یہی صورت حال مصر میں تمام سیاسی زعماء کی ہے۔ تمام جماعتوں کے قائدین خواہ ان کا تعلق سرکاری قومی جمہوری پارٹی سے ہو یا حزب اختلاف سے، ساٹھ ستر سال ہی کے ہیں۔ اور یہ سب سادات نے ربع صدی قبل جماعت سازی کی جو آزادی دی تھی، اسی کی پیداوار ہیں۔ سب سے بڑی مگر غیر قانونی عوامی جماعت اخوان المسلمین کے رہنما (جنہوں نے جمال عبدالناصر کے عہد میں قید کاٹی) بھی ستر کے پیٹے میں ہیں۔

جماعتی سرگرمیاں بھی ہفتہ یا مہینہ وار (رسالے یا پرچے کی) اشاعت اور چھوٹے موٹے تنظیمی امور تک محدود ہیں۔ سیاسی جماعتیں انتخابی مہموں کے علاوہ شاذ و نادر ہی کبھی کسی جلسے جلوس کا اہتمام کرتی ہیں۔ عوام میں کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پورے مصر میں سیاسی کارکنوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ (اس میں اخوان شامل نہیں ہیں جن کی مقامی شاخیں بہت سرگرم ہیں)۔ تمام جماعتیں اگرچہ جمہوریت کے قیام کے لیے کوشاں رہتی ہیں لیکن ان کے تمام انتظامی امور غیر جمہوری طرز پر انجام دیے جاتے ہیں۔ بیشتر پیشہ ورانہ انجمنوں اور غیر سرکاری رضا کار اداروں کا بھی یہی حال ہے۔ سالہا سال کی عوام دوست فوجی اور شخصی حکومت کے نتیجے میں جمہوری طور طریقوں کا وجود ہی کالعدم ہو گیا۔ جسے عرب کے دو بہترین سیاسی دماغ جارج طرابشی اور حسین احمد امین نے سخت الفاظ میں نشانہ تنقید بنایا ہے۔

ایک طرف سیاسی جماعتیں بے توجہی برت رہی ہیں تو دوسری جانب رائے دہندگان اس سلسلے میں ان سے کم نہیں ہیں۔ جماعتیں سرکاری فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتیں اور نہ ہی قومی مسائل پر بحث مباحثوں کو فروغ دینے میں دلچسپی لیتی ہیں۔ مصر کی قومی جمہوری پارٹی کا عبید کی کابینہ سازی میں کوئی ہاتھ نہیں۔ صرف ۱۹۹۷ء میں کاشتکاروں کے حقوق کے قانون کے سلسلے میں حزب اختلاف کی جماعتوں کی تشویش کا حکومت نے احساس کیا۔ ۱۹۹۰ء کے دوران جب سیاسی جماعتوں کی بجائے حلقہ انتخاب کی بنیاد پر پارلیمانی انتخابات منعقد ہوئے تو حزب اختلاف کی نشستیں ۲۰ فیصد سے کم ہو کر صرف ۳ فیصد رہ گئیں۔ یہ عمل جماعتوں کی مشکلات میں اضافے کی حکمت عملی کا ایک جزو تھا۔ کیونکہ حکومت اسلامی نظریات کی بحالی سے شدت پسندی کی حد تک خائف تھی۔ مراکش اور اردن میں بھی ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا گیا، جو ۹۱ - ۱۹۹۰ء میں الجزائر میں اسلامی جماعت (FIS) کی کامیابی سے مصر کی طرح لرزہ براندام تھیں۔

تاریخی حقائق

۱۹۹۰ء کے ابتدائی تاوسطی دور میں آزادی اظہار پر پابندیاں موجودہ دور میں تبدیلی کے آثار کے لیے ایک پیمانے کا کام دے سکتی ہیں۔ کیا ہم واقعی ۱۹۸۰ء کی آزادی اظہار کی طرف مراجعت کر رہے ہیں۔ کیا صحافت، اجتماعات، انجمن سازی کی زیادہ آزادیاں نصیب ہوں گی؟ انصاف کا عمل زیادہ شفاف ہوگا؟ کیا سیاسی عمل کے مواقع حاصل ہوں گے، جس میں وہ قوتیں کسی نہ کسی حد تک شمولیت اختیار کر سکتی ہیں جو پابندیوں کا شکار تھیں مثلاً شدت پسند اسلام؟

ابتدائی دور کی اظہار رائے کی آزادی تھوڑی بہت اس معاشی بحران کا شاخسانہ تھی جو تیل کی قیمتوں میں کمی کے سبب پیدا ہوا تھا۔ جس سے تیل پیدا کرنے والے ممالک کے علاوہ وہ عرب ممالک بھی متاثر ہوئے جن کا انحصار دولت مند خلیجی ریاستوں کی امداد اور رعایتوں، سیاحت، یا نہر سویز سے گزرنے والے تیل بردار جہازوں سے حاصل شدہ آمدنی پر تھا۔ اس بحران میں بڑھتی ہوئی آبادی نے مزید اضافہ کر دیا تھا۔

ناصر یا بعث کی مقبول فوجی حکومتوں نے معاشرہ میں بین الاقوامی تبدیلیاں لانے کے لیے عرصہ دراز تک عرب ریاستوں میں مداخلت جاری رکھی۔ لیکن اس مداخلت کے باوجود عرب ریاستوں کو مختلف

میدانوں میں مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر پیچھے ہٹ کر غیر سرکاری رضا کار تنظیموں اور تجارتی اقدامات کے لیے جگہ بنانی پڑی۔ ان حکومتوں کو بیرونی [مغربی ممالک کی] حمایت اور مدد حاصل کرنے کے لیے آئی ایم ایف کے سادگی اور کفایت شعاری کے پروگرام کی عوامی مقبولیت کے لیے کوششیں کرنا پڑیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ عوام کو امور سلطنت میں زیادہ سے زیادہ شریک کیا جائے۔ چالیس برس کی مداخلت کے بعد [پہلی بار] شہری معاشرے کی نشوونما کی کچھ گنجائش پیدا ہوئی۔ انجمن سازی، اجتماع اور صحافت پر موجود کچھ قانونی پابندیاں اٹھائی گئیں یا ان کو نرم کر دیا گیا اور انتخابات میں دھاندلی اور بدعنوانی میں بھی کمی آئی۔ تعلیم، فلاح اور صحت کے شعبوں کو جزوی طور پر سرکاری محکموں سے نکال کر فلاحی اداروں کے سپرد کر دیا گیا یا اس میدان میں نجی شعبے کو شرکت کا موقع فراہم کیا گیا۔

یہ امر بحث طلب ہے کہ کیا حکومتوں کو ابتدا ہی سے معاشی اور معاشرتی آزادی پر واقعی یقین تھا۔ بہرحال ۱۹۹۰ء کے ابتدائی برسوں میں جبکہ وہ معاشی آزادی کی فی الواقع قائل تھیں (یعنی ثماریات پر مبنی زیر فرمان معاشی ڈھانچے کا انہدام)، تاہم عرب حکومتیں اس عمل کو سیاسی آزادی سے منسلک کرنے کی حکمت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا رہیں۔ حکومت کی فلاحی کاموں سے دوری کے سبب جو خلاء پیدا ہوا اسے ان اسلامی انجمنوں نے پُر کیا جو بیرون ملک کام کرنے والوں کے ترسیل زر اور خلیجی ریاستوں کے نجی فلاحی اداروں کے چندے سے چل رہی تھیں۔ ان انجمنوں کی نظر میں غرباء کی امداد صرف کارِ خیر ہی نہیں تھا بلکہ یہ دعوہ اور اشاعت دین کا کام بھی تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر بنیاد سے کی جائے اور جس میں خواتین کی حیثیت سے لے کر نصاب تعلیم تک کے امور کو عوامی سطح پر حل کیا جائے۔ ان کی حتمی غرض و غایت یہ تھی کہ شہری اداروں کے اسلام پسند منتخب سربراہوں (میئرز) اور اسلام پسند ارکین اسمبلی کی تعداد میں اضافے کے ذریعے سیاسی عمل پر گرفت حاصل کی جائے۔ الجزائر میں ۱۹۹۱ء کے انتخابات میں اسلام پسند تنظیمیں FIS کی چھتری تلے پارلیمان میں اکثریت حاصل کرنے کے بہت قریب تھیں۔

یہ صورت حال ان حکومتوں کی طاقت پر اجارہ داری کے لیے خطرے کا نشان تھی، چنانچہ انہوں نے اپنی قدیم روش کی طرف مراجعت ہی کو غنیمت جانا۔ الجزائر میں [۱۹۹۱ء کے انتخابات میں من پسند نتائج

سامنے نہ آنے پر] وہاں کی حکومت نے انتخابات کے دوسرے مرحلے کو منسوخ کر دیا اور ملک میں ہنگامی صورت حال کا نفاذ کر دیا گیا۔ تیونس میں جس نے پہلی بار آزادیوں پر بندش کے عمل کا اجراء کیا تھا، ۱۹۸۷ء میں ملک کی سلامتی کے اداروں نے اپنے بوڑھے صدر حبیب بورقیہ کو صرف اس لیے معزول کر دیا کہ ان کے خیال میں وہ اسلام کے روز افزوں اثر ورسوخ سے پیدا ہونے والے خطرات کو روکنے کی سکت نہیں رکھتے تھے اور ان کے وزیر داخلہ اور سابق پولیس افسر زین العابدین بن علی کو ان کی جگہ صدارت پر فائز کر دیا۔ بن علی نے بنیادی آزادیوں کو ساقط کر دیا اور اسلامی انجمنوں کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس میں وہ تنظیمیں بھی شامل تھیں جو ایسی شدت پسند نہ تھیں کہ دعوہ کے عمل کے پھلنے پھولنے سے قبل ہی براہ راست یا افراتفری پھیلا کر اقتدار پر قابض ہونا چاہتی تھیں۔ پانچ سال بعد مصر، اردن، مراکش اور کویت نے بھی الجزائر اور تیونس کی طرح صدر کو تبدیل کیے بغیر یہی راستہ اختیار کیا۔ عراق، شام، لیبیا، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں میں اس قسم کی کوئی رجعت وقوع پذیر نہیں ہوئی کیونکہ وہاں کسی قسم کی سیاسی آزادی کبھی عطا نہیں کی گئی تھی۔

جن ممالک میں اس طرح رجعت فی الواقعہ ظہور پذیر ہوئی وہاں اس کا نشانہ صرف وہ اسلامی کارکن ہی نہیں تھے جو پرتشدد کارروائیوں میں ملوث تھے بلکہ وہ بھی تھے جو بزعم خود اپنے انقلابی پروگرام پر عدم تشدد سے عمل پیرا تھے یا نہایت صلح پسند اسلام پسند تھے۔ اس حفظ ماتقدم کا اصل مقصد شہری آزادیوں کا مکمل امتناع تھا۔ (تاہم یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں کے دہشت ناک ماحول کا اعادہ نہیں ہوا)۔ ان اقدامات سے بائیں بازو والوں، پان عرب خیالات والوں، حقوقِ انسانی کی انجمنوں، اور دیگر غیر اسلام پسند اختلاف کی جماعتوں پر اثر پڑا۔ ان کی مطبوعات کو سنسر کیا گیا، ان کے تحت کام کرنے والے رضا کار اداروں کی مالی اور دیگر امور میں سخت نگرانی کی گئی، ان کے کارکنوں کو ذاتی اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں خوف زدہ کیا گیا۔

نسبتاً آزاد حکمت عملی اختیار کرنے والی جن ریاستوں کو ہم یہاں زیر بحث لائے ہیں ان میں تیونس نے واپس سخت گیر طریق کار کی طرف مراجعت میں بھی اتنی ہی تیزی دکھائی جتنی استقامت کا مظاہرہ اس نے معاشی طبقے میں پابندیوں سے آزاد حکمت عملی اختیار کرنے میں کیا تھا مثلاً نجکاری، برآمدی مال تیار

کرنے والی صنعتوں اور سیاحت وغیرہ۔ نتائج توقع کے عین مطابق برآمد ہوئے یعنی معاشی پیش رفت کے ساتھ ہی سخت سیاسی پابندیاں۔ زین العابدین بن علی کے دور میں تیونس کی برآمدات (۱۹۹۰ء سے ۵ء۴ فیصد) میں اضافہ ہوا، ملک میں سیاسی استحکام کے سبب غیر ملکی سرمایہ کاروں نے دلچسپی کا اظہار کیا، تعلیم یافتہ افرادی قوت، عوام کے معیار زندگی میں خوشگوار تبدیلی (فی کس سالانہ آمدن ۲۰۰ء۲ ڈالر، جو مصر سے دوگنا ہے)، معاشرے میں مڈل کلاس کی توسیع، (تیونس میں تین چوتھائی سے زیادہ خاندانوں کے پاس اپنے فلیٹ ہیں) اور غربت کا قریب قریب خاتمہ، نمایاں کامیابیاں ہیں (اس کے برخلاف مصر اور اردن میں بالترتیب ۱۵ء۲ اور ۲۴ فیصد لوگوں کی روزانہ آمدنی ۲ ڈالر سے بھی کم ہے)۔ یہ مادی فوائد سیاسی نظام پر مکمل پابندی کا ثمر ہیں جن میں نہایت ڈھٹائی سے انتخابات کے نتائج کو حسب منشاء تیار کرنا، ذرائع ابلاغ کی زبان بندی، سنسر شدہ مطبوعات اور سیاسی کارکنوں اور حقوق انسانی کے کارندوں پر ظلم و جور شامل ہیں۔

تیونس کے عوام بالخصوص وہاں کے مڈل کلاس کے افراد کو یہ صورت حال منظور ہے۔ اس کی ایک وجہ پیٹ بھر روٹی ہے۔ وہ مادی فوائد سے بہرہ مند ہونے پر قانع ہیں۔ راضی بہ رضا رہنے کی ایک وجہ وہ خوف بھی ہے جو الجزائر کی خانہ جنگی نے ان کے دلوں میں پیدا کر دیا ہے، جہاں اسلامی شدت پسندوں کو دہشت گردی کا ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ حکومت کا یہ پسندیدہ موضوع ہے جس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے لیکن فرانسیسی اور اطالوی ٹیلی وژن کی شام کی نشریات ناظرین کو اس کا قائل کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مصر، اردن، مراکش اور کویت نے بھی اس راہ کو اختیار کیا ہے، تاہم وہ اُس حد تک نہیں پہنچ سکے جس حد تک دونوں پہلوؤں سے تیونس پہنچ چکا ہے۔ ان کی ترجیحات میں معاشی آزادی سرفہرست ہے (جہاں خصوصاً مصر اور مراکش میں اس کے نہایت خوشگوار نتائج برآمد ہوئے ہیں)۔ وہ سیاسی پابندیوں میں کسی طرح کی نرمی کا خطرہ مول لینے کو بالکل تیار نہیں ہیں۔

مخلوط علامتیں

متذکرہ ممالک کے مستقبل کے منصوبوں میں معاشی آزادیوں کو ترجیح حاصل ہے۔ مصر میں وزیر اعظم عاطف عبید کی حکومت نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ عظیم منصوبوں کو جنوب (اسوان، توشکا) شمال اور شمال مشرق (بندر سعید، سینائی، خلیج سویز) میں آگے بڑھایا جائے۔ اس کام کے لیے نئے ماہرین مقرر

کیے گئے ہیں۔ ان منصوبوں کا مقصد نہ صرف معاشی ترقی کو مہمیز کرنا ہے بلکہ صوبوں اور دیہی علاقوں سے قاہرہ کی جانب انتقال آبادی پر قابو پانا بھی ہے۔ اسی طرح جدید ترین ٹیکنالوجی اور زرعی پیداوار کے استعمال کے ترقی یافتہ طریقوں سے استفادہ کرنے والی صنعتوں کی حوصلہ افزائی پر بھی حکومت خصوصی توجہ دے رہی ہے جس کی تفصیلات ابھی واضح نہیں ہوئی ہیں۔ مراکش کے نئے حکمران کی خصوصی توجہ کا مرکز ملک کے مشرق اور شمال مشرق کے غیر ترقی یافتہ خطے (دارالسیبا یا سرزمین بغاوت) ہیں۔ دوسری جانب اردن میں بادشاہ کی کوشش ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کار وہاں سرمایہ کاری میں عملی دلچسپی لیں اور یورپی ممالک اور امریکہ اس کے قرضہ جات پر نئے سرے سے گفت وشنید کریں۔

سیاسی محاذ پر مخلوط اشارے اور علامتیں نظر آتی ہیں۔ الجزائر میں اگرچہ استصواب کے نتائج نہایت حوصلہ افزا تھے تاہم حکومت کی تشکیل میں بوطفلیقا کو آٹھ ماہ لگے اور حکومت نے سیاسی عمل کے آغاز اور چند سابقہ باغیوں کی فوج میں شمولیت کے کام میں کسی قسم کا کوئی بامقصد قدم نہیں اٹھایا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ دس برس سے الجزائر میں صحافت نے تمام عرب ممالک میں سب سے زیادہ آزادی کا اظہار کیا ہے اور اب اس میں بے چینی اور مایوسی جھلکتی جارہی ہے۔ اگرچہ خانہ جنگی کے سبب الجزائر کی صورت حال غیر معمولی ہے تاہم جن مسائل کا بوطفلیقا کو سامنا ہے وہ ان بنیادی عناصر کی نشان دہی کرتے ہیں جو عرب ممالک کی غیر معمولی پریشان کن صورت حال میں مضمر ہیں۔ حکومت کے لیے کسی خاص فیصلے تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ فوج کے ایک طبقے کی حکومت کی ہیئت ترکیبی اور باغیوں اور سابقہ FIS کے خلاف اقدامات کی مخالفت ہے۔ فوج اور خفیہ اطلاعات کے اداروں کا کلیدی کردار (دیگر عرب حکومتوں کی طرح) محض آزادی سے قبل کی صورت حال کا ورثہ نہیں ہے بلکہ یہ اسلام پسندوں کے تشدد کا بھی ثمر ہے جو اب بھی ایسی قوت ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مراکش میں اگرچہ شاہ محمد سادس، وزیر اعظم بصری کو (ظاہر ہے فوج کی مرضی سے) معزول کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں تاہم اب بھی انہیں بصری کے جانشینوں اور فوج کے اعلیٰ عہدیداروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً اس وقت سے یہ ضروری ہوگیا جب اسلام پسندوں نے اس بل کے خلاف بڑے پیمانے پر مظاہروں کا بندوبست کیا جس کا مقصد خواتین کو جدید تہذیب میں رنگنا تھا۔ اردن میں عبداللہ ثانی نے جنرل سمیع البطیحی کو اپنے عہدے سے نہیں ہٹایا جو

خفیہ محکموں کے سربراہ ہیں اور مملکت کے دوسرے اہم ترین عہدے پر فائز اور وراثت کے عمل کے دوران شاہ کے بہترین معاون تھے۔

بالفاظ دیگر نئے اور نوجوان حکمران جن سے عربوں اور عالمی پریس نے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر رکھی ہیں فی الواقعہ اپنے عمل میں بااختیار نہیں ہیں (کم از کم مصر، یمن اور تیونس کے حکمرانوں کی حد تک، ثانی الذکر فوج اور خفیہ اداروں پر انحصار کرتے ہیں)۔ یہ بات بوطفلیقا پر بھی صادق آتی ہے جو نئے حکمرانوں میں سب سے زیادہ معمر اور تجربہ کار ہیں اور جنہیں فوج میں سخت رائے رکھنے والوں اور اعتدال پسندوں میں توازن رکھنا پڑتا ہے۔ محمد سادس اور عبداللہ ثانی کو کسی قسم کا سیاسی تجربہ نہیں تھا (اگرچہ عبداللہ ثانی کو قابل ذکر فوجی تجربہ حاصل ہے) کیونکہ ان کے والد نے انہیں کبھی امور سلطنت میں شریک نہیں کیا تھا۔ ان کی کبھی سیاسی بحران میں آزمائش نہیں ہوئی تھی۔ ممکن ہے انہوں نے سمندر پار حصول تعلیم کے دوران جدید خیالات سے بھی استفادہ کیا ہو (مراکش کے نئے حکمران نے گرینوبل یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ڈگری حاصل کی۔ جبکہ شاہ عبداللہ ثانی نے میساچوسیٹ امریکہ کی ڈیرفیلڈ اکیڈمی اور سندھرسٹ برطانیہ کی رائل ملٹری اکیڈمی میں تعلیم حاصل کی)۔ اس تعلیم کا اثر ابھی تک نظر نہیں آ رہا ہے۔

ایسے ہی شکوک شام کے بشار الاسد اور عراق کے قصی صدام حسین پر بھی صادق آتے ہیں جوان ممالک کے حکمرانوں کے جانشین شمار ہوتے ہیں۔ دونوں کی پرورش ایسی نہایت پابند مملکتوں میں ہوئی ہے جنہیں ان کے والدین مقبول فوجی حکمرانی سے خاندانی جمہوریت میں تبدیل کر رہے ہیں۔ قصی کبھی قابل ذکر عرصے کے لیے عراق سے باہر نہیں گئے۔ بشار نے جو ڈاکٹر ہیں لندن کے امراض چشم کے ہسپتال میں کچھ عرصہ گزارا ہے۔ لیکن یہ علم نہیں کہ وہ برطانوی سیاسی کلچر سے کہاں تک متاثر ہوئے ہیں۔ دو مزید صاحبزادے ہیں جنہیں اپنے والدین کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ ان میں ایک لیبیا کے کرنل قذافی کے بیٹے اور دوسرے یمن کے علی عبداللہ صالح کے صاحبزادے ہیں۔ لیکن ان سے بھی یہ توقع نہیں کہ یہ جمہوری تبدیلی لائیں گے۔

خوف اور عالمی ظرفی

عرب دنیا میں اسلام پسندوں اور حکومتوں کے درمیان کشمکش کے حوالے سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا

حکومت فتح کے بعد عالی ظرفی کا مظاہرہ کرے گی؟ یہ نہایت فیصلہ کن سوال ہے۔ صرف سابقہ اسلامی دہشت گردوں کے لیے نہیں بلکہ ان اصلاح پسند اسلامی تنظیموں کے لیے بھی جو تشدد سے دُور رہ کر ہی ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے کوشاں رہی ہیں۔ یہ تنظیمیں بھی پرتشدد تنظیموں کے خلاف سخت گیر اقدامات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ صرف ان ہی ملکوں میں نہیں جہاں دہشت گردی ہو رہی تھی بلکہ ہمسایہ ممالک (اردن، کویت، مراکش) میں بھی یہ متاثر ہوئیں۔ اس کا مقصد حفظ ماتقدم اور تحریک کو مزید پھیلنے سے روکنا تھا۔

اس تاریخی تناظر میں عالی ظرفی ایک اخلاقی خوبی نہیں بلکہ سیاسی ضرورت بن جاتی ہے۔ سیاسی عمل کے لیے گنجائش پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ غیر روایتی اسلامی تنظیموں اور سابقہ تشدد پسند انجمنوں کے اراکین کو جو تشدد سے تائب ہو چکے ہیں کاروبار حکومت میں تھوڑا بہت شریک کیا جائے، جو ایک معقول بات ہوگی۔ خصوصی تنظیموں اور معاشرتی گروہوں کا کردار بھی طویل المدت سیاسی نظام کے استحکام میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ جب تک ان تحریکوں پر قانونی پابندیاں عائد ہیں (مثلاً یمن اور اردن میں) کسی مفید سیاسی عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خواہ یہ حکومتیں کتنے ہی وعدہ وعید کرتی رہیں۔

تاہم عالی ظرفی ان حکومتوں کی سوچ میں کہیں نظر نہیں آتی۔ سالہا سال کے تشدد کے سبب سلامتی کے اداروں کے اعلیٰ عہدیداروں میں انتقام و تشکیک کی روایات کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ موقع پرست اسلامی تنظیموں کی طرف سے بھی جو تشدد سے کنارہ کش رہی ہیں ان کے ذہن صاف نہیں ہیں۔ انہیں خوف ہے کہ کہیں بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے نئے نظام حکومت میں داخل نہ ہو جائیں اور رفتہ رفتہ اسے تبدیل نہ کر ڈالیں۔ اگر ایک بار اقتدار ان کے ہاتھ میں آ گیا تو خوف ہے کہ وہ اس سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے۔ جمہوری نظام سے ان کے لگاؤ کا بنیادی اصول ہے ''ایک فرد، ایک ووٹ، ایک بار''۔ (اس کی مثال سوڈان کا اسلامی نظام ہے)۔ سلامتی کے ادارے عوام کی شرکت کو ٹروجن کا گھوڑا سمجھتے ہیں جس کے پردے میں دشمن داخل ہو کر اقتدار پر قابض ہو سکتے ہیں۔ لیکن اسلام پسند حلقوں کی پیش بندی کی قیمت عوام کی شرکت میں تخفیف کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ انہیں خواہش تو مستحکم حکومت کی ہے لیکن سیاسی عمل کو برداشت کرنے کا یارا نہیں ہے۔

اسلام پسندوں کے بارے میں بدگمانیاں

صرف صاحبانِ اقتدار ہی انتہا پسند مسلمانوں پر عدم اعتماد میں مبتلا نہیں بلکہ یہ بدگمانی متعدد مخالف جماعتوں میں بھی سرایت کر چکی ہے۔ خصوصاً آزاد خیال حلقے جو مڈل کلاس کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اس سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اس بدگمانی کے لیے ان کے پاس معقول وجہ بھی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں اسلام پسند حلقوں نے اس کے مضمرات کا احساس کیے بغیر اور اپنے تنظیمی امور میں اسے شامل کیے بغیر ہی بڑے زور و شور سے جمہوریت کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ اس نعرہ کو اپنانے کے فوائد ظاہر تھے۔ اس کی بنیاد پر اسلام پسند حلقے اس قانونی جہنم سے نکل سکتے تھے جس میں سابقہ مقبول حکومتوں نے انہیں دھکیل دیا تھا اور جواب خود بھی عوام کی شرکت، متعدد سیاسی جماعتوں کے قیام، حقوق انسانی وغیرہ کی قائل ہونے کی دعویدار ہیں۔ بہرصورت ان جنگجو جماعتوں کے لیے تشدد کوئی پسندیدہ لائحہ عمل نہ تھا جو ناصر کے قید خانوں سے تازہ تازہ رہا ہوئیں تھیں۔ انہیں سبق مل چکا تھا (ایسا سبق جو متعدد پرتشدد کارکنوں نے کئی سال بعد سیکھا تھا)۔

۱۹۷۰ء میں اسلام پسندوں نے اپنی نیک نیتی کا اظہار کرنے والے مسلمانوں کا طرزِ استدلال اختیار کیا کہ جمہوریت اور شوریٰ ہم معنی ہیں جس کی رو سے حکمران کے لیے ضروری ہے کہ وہ امور سلطنت میں رعایا سے مشورہ کرے۔ حالانکہ دراصل شوریٰ کا مقصد یہ ہے کہ ماہرین قانون سے رائے لی جائے عوام کے نمائندوں سے نہیں۔ تاہم ازمنہ وسطیٰ میں اس اصول کو نظرانداز کیا گیا اور اس پر کم ہی عمل درآمد ہوا۔ ایسے مباحث جن کا تعلق عقائد کے خلاف خیالات، الحاد، لادینیت سے ہو، انہیں اب بھی زیر بحث نہیں لایا جا سکتا ہے۔ ان امور کے سب فیصلے شریعت کے مطابق ہوں گے جسے غیر واضح اصول کے تحت یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ خواتین کے ساتھ مساوی سلوک، یا شرعی حکومت میں غیر مسلم کی حیثیت کے بارے میں بھی اسی قسم کے اصولوں کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

غلو سے کام لینے والے اور کٹر مذہبی حلقوں کا یہ موقف ہے کہ جمہوریت ایک مغربی تصور ہے جو جدید تہذیبی عناصر سے ملوث ہے، جسے رد کر دینا ہی بہتر ہے۔ اس طرح کے غلو سے کام لینے والے شدت پسند اسلامی حلقوں اور شعلہ بیان خطیبوں میں اکثر و بیشتر پائے جاتے ہیں۔ نابینا شیخ عمر عبدالرحمٰن نے حال ہی میں ایک فتویٰ امریکی قید خانے سے جاری کیا ہے جس کی رو سے کسی قسم کی بھی سیاسی جماعتوں کی

تشکیل خلاف شرع ہے۔ اس فتوے کی رُو سے اسلام میں صرف ایک ہی جماعت حزب اللہ کی گنجائش ہے۔ خیالات یا انتخابی مقابلوں کے بازار لگانا خلافِ عقل کام ہے۔ اس فتوے کو خفیہ جہادی تنظیمیں تسلیم کرتی ہیں جبکہ اخوان المسلمین بھی اس پرا لجھن کا شکار ہوگئی ہے۔

شدت پسند اسلامی حلقے معتدل اسلامی اصلاح پسندوں پر تلون مزاجی، موقع پرستی اور بے اصولی کے الزام لگاتے ہیں جو سوئے ظن کے شکار سرکاری کارندوں اور آزاد خیال حلقوں کو برحق نظر آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شوریٰ کا تصور، انفرادی حقوق، اقتدار میں تبدیلی اور محدود سرکاری نظام کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ یہ تصور ازمنۂ وسطیٰ کے تصور شوریٰ سے کسی حد تک بیگانہ ہوسکتا ہے مگر متضاد نہیں ہے۔ بایں ہمہ جان کورٹنی مرے جیسے اہل فکر نے نصف صدی قبل رومن کیتھولک حلقوں میں آزاد خیال جمہوریت کو قابل قبول بنانے کے لیے ازمنۂ وسطیٰ کے چند تصورات سے کام لیا تھا۔

تاہم جہاں تک ''شوریٰ'' کا تعلق ہے اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اس ضمن میں پیدا شدہ مشکلات کے حل پر توجہ نہیں دی گئی۔ فلسطین کے ایک اہل قلم منیر شفیق جیسے بہت کم افراد ہیں جنہوں نے ۱۹۹۲ء میں حقوق انسانی، اقتدار کی تبدیلی، خود اسلامی تحریکوں میں جمہوری اقدار پر عمل درآمد کے لیے آواز بلند کی۔ انہوں نے یہ بھی زور دیا ہے کہ ایسے شرعی قوانین کا نفاذ کر کے وقت کے ان تقاضوں کو پورا کیا جا سکتا ہے جو آزاد خیالی کے اصولوں پر مبنی ہوں۔

شفیق نے تحریک سے تقاضا کیا کہ وہ حقائق کا سامنا کرے۔ اسلامی احیاء آزاد اور مہذب معاشرے کی تشکیل کا متقاضی ہے جو صرف جمہوریت ہی میں ممکن ہوسکتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی طرز حیات کا احیاء، جو شخصی حکومتوں کے تحت معدوم تو نہیں مگر زوال سے دوچار ہے اسی امر پر منحصر ہے۔ خلفاء راشدین کے دور کے تصورات و نظائر میں ایسی اسلامی روایات کا کھوج لگایا جا سکتا ہے جو جمہوریت کے متعدد عناصر کی نشان دہی کرتی ہوں۔ شفیق نے اسلام پسندوں کو آگاہ کیا کہ آزاد خیال جمہوری اقدار کو تسلیم کیے بغیر ان کے لیے یہ ناممکن ہوگا کہ وہ اقتدار پر قابض حکام کو نظام حکومت میں عوام کی شرکت پر رضامند کریں یا عوامی عمل دخل میں توسیع کے لیے حزب اختلاف کی دیگر جماعتوں کے ساتھ تعاون کے قابل ہوسکیں۔ تاہم شفیق کے دلائل نے کوئی نمایاں تاثر نہیں چھوڑا۔ ۱۹۹۰ء کے دوران میں عدم تشدد پر عمل

کرنے والی اسلامی تحریکوں میں بھی کسی قسم کے جمہوری رجحانات کا پتہ نہیں چلتا۔ مصر میں تین مقدمات نے بڑی شہرت حاصل کی۔ لادینی مفکر فراج فوضا کا قتل، نوبل انعام یافتہ ناول نگار نجیب محفوظ پر قاتلانہ حملہ، اور ناصر حامد ابوزید کے خلاف عدالت کا الحاد کا فیصلہ، ان تینوں معاملات پر اخوان المسلمین اور ان کے قریب دیگر جماعتوں نے مبہم سا موقف اختیار کیا۔ پہلے دو معاملات میں تشدد کا جواز پیش کیے بغیر انہوں نے کم از کم اتنا ضرور اشارہ دیا کہ فوضا اور محفوظ نے پرجوش مسلم نوجوانوں کو اپنی حرکتوں سے ناراض کر دیا۔ تیسرے معاملے میں انہوں نے شیخ کی کھلم کھلا حمایت کی اور ان کے فیصلے کو سراہا کیونکہ زید نے ابتدائی اسلامی قوانین پر سخت ناقدانہ نظر ڈالی تھی۔ انہوں نے اس فیصلہ کو خوب سراہا جس کی رُو سے بیوی سے اس کا نکاح منسوخ ہو گیا تھا کیونکہ مسلمان خاتون کسی ملحد کے نکاح میں نہیں رہ سکتی ہے۔ اس طرح وہ دراصل جلاوطن ہو گیا تھا۔

یہ اپنی قسم کے منفرد واقعات نہیں ہیں۔ مصر کی اسلام پسند تحریک نے اپنے اختلافات اور مبہم ڈھانچے کو نظر انداز کرتے ہوئے دیگر ''ملحدوں'' ـــــ جدت پسند اور اسلامی اسکالر اور دانشور حسن حنفی، سید القمنی اور خلیل عبدالکریم کے خلاف اخباری مہم کا متحد ہو کر بھرپور ساتھ دیا۔ اردن اور کویت میں اسلام پسندوں نے کتابوں کے میلوں میں ''غیر مذہبی'' کتب پر (جو راسخ العقیدگی کے خلاف تھیں) پابندی لگوانے کی کوشش کی۔ کویتی پارلیمان کے اسلام پسند اراکین نے ملحدانہ خیالات کی حامل کتب کے خلاف سخت اقدامات کے بل پیش کیے۔ حال ہی میں کویت کے چند اسلامی بنیاد پرستوں نے آزاد خیال احمد البغدادی پر فوجداری مقدمہ دائر کر دیا ہے کیونکہ وہ اپنے ایک مقالے میں یہ کہہ کر توہین رسالت کا مرتکب ہوا تھا کہ آپؐ سے ابتداء میں تبلیغ اسلام میں [نعوذ باللہ] کوتاہی سرزد ہوئی تھی۔ عدالت نے اسے ایک ماہ قید کی سزا سنائی۔ اپنی اس کامیابی سے سرشار ہو کر انہوں نے دو شاعرات کے خلاف بھی اس قسم کے مقدمات دائر کیے۔ لبنان میں ان کے سنی العقیدہ ہم خیالوں نے ایک مقبول عیسائی گلوکار مارسل خلیفہ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی ہے کیونکہ وہ ایک فلسطینی شاعر محمد درویش کا ایک ایسا گیت گا کر توہین کا مرتکب ہوا تھا جس میں ایک قرآنی آیت شامل کی گئی تھی۔

خلیفہ کا یہ مقدمہ اور نظارت میں ایک گرجا گھر کے قریب تعمیر مسجد کے لیے جدوجہد نے اسلام

پسندوں کے غیر مسلموں کے ساتھ سلوک کا نیا معاملہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس موقع پر اخوان نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اور شمالی مصر میں قبطیوں کے خلاف تشدد کی مذمت کی ہے۔ لیکن ان کے نئے امیر مصطفیٰ مشہور نے یہ کہہ کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ اسلامی ریاست میں قبطیوں کو قدیم خلافت کے دور کی طرح ذمی یعنی دوسرے درجے کی حیثیت حاصل ہوگی۔ انہیں اقتدار میں محدود شرکت کا حق حاصل ہوگا اور انہیں جزیہ ادا کرنا پڑے گا۔

اخوان کے حلقے سے مشہور کی اس رائے کے خلاف صرف چند آوازیں ہی بلند ہوئیں لیکن لائق احترام ماہر قانون محمد سلیم العوا کی آواز ان میں نمایاں تھی۔ اوا نے اپنے فقہی علم و فضل کے زور پر ابوزید اور خلیفہ کے خلاف توہین اسلام کے الزام کی پرزور مذمت کی۔ ان کے خیال میں یہ الزام غیر مناسب اور اہانت کا عکاس تھا۔ اس نے یہ بھی دلیل دی کہ موجودہ دور اور موجودہ حالات میں شرعی حدود (زنا کے لیے سنگسار کرنا، یا چور کے ہاتھ کاٹنا) کے نفاذ کا دعویٰ (جیسا کہ اسلام پسند کرتے ہیں) معقول نہیں ہے۔ اسلام کے شدت پسند حلقوں نے اوا (اور شفیق) کی یہ بات سنی ان سنی کر دی۔ انہوں نے کہا کہ ان دونوں دانشوروں کے کھڑے کیے ہوئے مخمصے پر غور کریں گے کہ جمہوریت کے بغیر دعوۃ کا کام موثر نہیں ہو سکتا۔ یہ مخمصہ اس صورت میں زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے کیونکہ تشدد کے ذریعہ کلام الٰہی کی تبلیغ ناکامی سے دوچار ہو چکی ہے۔

یہ امر تعجب خیز نہیں کہ عرب آزاد خیال حلقے، اسلام پسندوں کو اگر کٹرپن کا لبادہ اوڑھے ہوئے نہیں تو ''غیر آزاد جمہوریت'' (illiberal democracy) کا پیش کار تصور کرتے ہیں۔ اس تاثر میں سرکاری حلقے بھی شریک ہیں جسے مزید تقویت اس بنا پر حاصل ہوئی کہ آزاد خیال افراد اور متعدد اپوزیشن کی جماعتوں کو اسلام پسندوں کے ساتھ انتخابی اتحاد کے سلسلے میں تلخ تجربات ہوئے تھے۔ (مثلاً مصر میں ۸۷-۱۹۸۴ء کے انتخابات اور اوائل ۱۹۹۰ء میں اردن اور مصر کے پارلیمانی انتخابات) ان تمام مواقع پر اسلام پسندوں نے اقتدار پر خود قابض ہونے کی کوشش کی۔ ان جماعتوں نے دیکھا کہ اخوان نے کس طرح ڈاکٹروں، قانون دانوں، انجینئروں اور صحافیوں کی انجمنوں پر قابو پانے کا اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے ان کے مالی اور انتظامی امور پر نہایت سخت گیری سے کام لیا تھا۔ اس لیے آزاد خیال حلقے اخوان کو ایک

سیاسی جماعت کے طور پر قانونی حیثیت دینے میں تذبذب کا شکار ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ اخوان کو (اردن، مراکش اور کویت میں) ایک سیاسی جماعت یا رضا کار سماجی انجمن کا درجہ دیا جائے یا انہیں (مصر، الجزائر اور تیونس کی طرح) کسی نہ کسی طرح کی قانونی حیثیت دی جائے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ حزب اختلاف کسی بھی طرح کا سیاسی عمل شروع کرنے میں کمزوری کا شکار ہوگئی ہے۔

ماضی سے چھٹکارا

الجزائر کے حالات سابق صورت حال سے یکسر مختلف ہیں۔ ۹۲-۱۹۹۱ء کے نتائج کی منسوخی اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی خانہ جنگی سے حزب اختلاف کی جماعتوں نے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ تشدد سے تائب FIS کے حلقہ کو سخت چھان بین کے بعد سیاسی امور میں شامل کرلیا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ FIS کے کن طبقوں کو اس جزوی شرکت کا اہل قرار دیا جائے (غالباً وہ گروہ جس کی قیادت عباسی مدنی، اور رباہ کبیر کرتے ہیں اور جزازہ کا گروہ بھی جو عبدالقادر ہاشانی کے تحت تھا جنہیں قتل کیا جاچکا ہے۔)

عرب حکمران اسلام پسندوں کی طویل متشدد کارروائیوں کی تلخ یادوں اور جذبہ انتقام کے سبب ان کے ساتھ کبھی رعایت سے کام نہیں لیں گے۔ یادیں جتنی تلخ ہوں گی فراخ دلی کی گنجائش اتنی ہی کم ہوگی۔ اس طرح بوطفلیقا کو اپنی شاندار عوامی حمایت اور سیاسی جوڑتوڑ میں مہارت کے باوجود ماضی سے چھٹکارا حاصل کرنا آسان نہ ہوگا۔

ماضی سے چھٹکارا حاصل کرنے میں تقدیم کا عمل یا تو اوپر سے شروع ہوگا یا پھر نچلے طبقے اس جانب قدم اٹھائیں گے ـــــ حاکم آگے بڑھیں گے یا محکوم ـــــ لیکن اس کے لیے دونوں میں باہمی تعاون ضروری ہے۔ اگر اس سمت کوئی پیش رفت نظر آتی ہے تو اس کا تعلق تبدیلی کے اس رجحان سے قطعاً نہیں ہے جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا تھا لیکن یہ الاوا اور شفیق کے خیالات کو منظم طریقہ سے عمل میں لانے کا ثمر ہے۔

اخوان کے تیس سال سے زائد عمر کے فعال اراکین نے تین برس قبل اس سمت دلچسپ اقدام کیا تھا۔ ان میں سے بیشتر کی تربیت بالائی مصر کی تعلیمی انجمنوں میں ہوئی تھی اور ۱۹۸۰ء کے اوائل میں انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ انہوں نے ایک سیاسی جماعت الوسط کے قیام کا اعلان کیا جس کے قائد ابوالاولی مادی تھے جو تحریک کے ساتھ اپنی وابستگی کے باوجود اخوان کی ستر سالہ قیادت کے

خلاف ایک قسم کی بغاوت کی نشان دہی کرتی ہے۔ الوسط کا خیال تھا کہ تشدد کے نتائج تباہ کن نکلے ہیں۔ سیاسی، سماجی اور تعلیمی عمل گھٹن کا شکار رہا۔ اس بند گلی سے نکلنے کا راستہ یہی ہے کہ آزاد خیال سیاست کے اصولوں کو بلا چوں و چرا منظور کر لیا جائے اور انفرادی حقوق، بنیادی آزادیوں، محدود اقتدار، سیاسی مسابقت، حکومت کی تبدیلی اور شفاف عمل کو تسلیم کیا جائے۔ (جماعت کو الحادی اور مشرکانہ تصورات کا جواز بہر حال منظور نہیں ہے)۔ موجودہ مشکلات کے اسلامی حل کے لیے جزوی اور اجتماعی اصلاحات مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ تحریک میں جمود اسلامی مفاد کے لیے مُضر ہے اور ایک مفید معاشرتی قوت کے طور پر اس کے زوال میں تیزی آ جائے گی۔ عوام کے بغیر اسلامی حل ممکن نہیں ہے۔

اخوان کی قیادت نے اس چیلنج کو رد کر کے الوسط کے بانیوں کو جماعت سے خارج کر دیا۔ مادی کا گروہ قائم رہا، اگرچہ حکومت کی طرف سے اسے جماعت کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ تاہم حکومت نے اپریل ۲۰۰۰ء میں ان کے ساتھ رعایت برتی اور جزوی قانونی جواز فراہم کیا۔ مصر میں معاشرتی امور کی وزارت نے ایک ایسے گروہ کو جس میں اکثریت الوسط کے اراکین کی ہے ایک رضا کار تنظیم مصری جماعت برائے ثقافت و گفت و شنید کے نام سے قائم کرنے کی اجازت دی جس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے سے تشدد کے خاتمے کے لیے گفت و شنید کے عمل کو فروغ دیا جائے۔

النہضہ کی تحریک میں بھی عوام کی شرکت پر بحث و تمحیص کا سراغ ملتا ہے جو تیونس میں ''اخوان'' کا عکس ہے۔ FIS کے متعدد گروہوں میں شہری ہم آہنگی کے قانون (Civil Concord Act) پر گرما گرم بحث جاری ہے۔ اسلامی تحریک میں اس ہلچل کی حیثیت محض ایک ہلچل ہی کی ہے۔ اس کا ان مشکلات پر کوئی اثر نہیں پڑتا جن میں یہ مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ نہ تو اقتدار پر بزور قبضہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی جمہوریت کے بارے میں اپنی رائے بدل کر معاشرہ کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ غیر اسلام پسند مخالف جماعتوں کی کمزوری اور آزاد جمہوری عمل سے حکومت کی عدم دلچسپی کے سبب ان مشکلات کا خاتمہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

[عمانوئیل سیوان یروشلم کی ہیبریو یونیورسٹی (Hebrew University) میں تاریخ کے پروفیسر اور "انتہا پسند اسلام" سمیت متعدد کتب اور مقالہ جات کے مصنف ہیں۔]